21 POEMS

BY

WALT WHITMAN

Translated by :—

ABDUR RAUF

Lecturer in URDU

CALCUTTA UNIVERSITY

والٹ وھٹمین کی ۲۱ نظمیں

ملنے کا پتہ

رائٹرس کورنر
نمبر ۵۰ علیم الدّین اسٹریٹ
کلکتہ - ۱۶

عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر

حضرت پرویز شاہدی کا

شعری مجموعہ

تثلیثِ حیات

شائع ہوگیا ہے۔ عمدہ کاغذ دیدہ زیب طباعت
اور قیمت صرف ساڑھے سات روپے

ملنے کا پتہ

معرفت محمد واسم ۷۶۔ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

معرفت منصور احمد ملک سی ایم او ہائی اسکول
۱۱۔ پیٹر لین۔ کلکتہ

ترقیاں ہوں، تجارت ہو یا سیاست ہو
ہر اک کا مرتبہ پہلے جو تھا سو اب بھی ہے

ہاں! روح ایک حقیقت ہے اور مثبت بھی
مقام جس کا دلائل کی حد سے باہر ہے
نمو سے ہوتی ہے جس کے وجود کی تصدیق

معانی ملتے ہیں پھر ایک ایسے شاعر کو
جو آب و گل کی صداقت کے گیت گاتا ہے
انھیں معانی سے بنتا ہے اِک لغت ایسا
کہ جس کو کوئی ضرورت نہیں طباعت کی

جو بہترین ہے یکسر نگفتہ رہتا ہے
سعی جو کرتا ہوں میں بہترین کہنے کی
زباں کانپتی ہے، لڑکھڑانے لگتی ہے
خلش سی ہوتی ہے اور دم پھڑکنے لگتا ہے
کچھ ایسا لگتا ہے گویا زبان منھ میں نہیں

جو شاہکار معانی زمیں کا حصہ ہیں
بیاں کی حد میں انھیں کوئی کسطرح لائے
کوئی بھی چیز ہو، اپنی جگہ یہ قائم ہے
زمیں اتنی ہی مثبت ہے جتنی پہلے تھی
حقائق اور مذاہب کا ہے مقام وہی

مطابقت نہ اگر ہو زمیں کی وسعت سے
تو کوئی قدر نہیں اعتبار کے لائق
وہ شاعری ہو سیاست ہو دین و مشرب ہو

زمیں کا زور، توانائی، قوتِ برداشت
ہر اک شے کو پرکھنے کی اِک کسوٹی ہے
مری نظر کی رسائی ہے اس محبت تک
جو کھینچتی نہیں دامن کسی کا اپنی طرف
مگر جو خود ہی کھنچے اسکو روکتی بھی نہیں

مری نظر میں ہے، ایسا مقام بھی کہ جہاں
ہر اک صوت سے بیگانہ ہوتے ہیں الفاظ
اگرچہ قید سماعت سے ہوتے ہیں آزاد
بیان کرتے ہیں لیکن زمیں کی اصلیّت
زباں کے بس میں نہیں جس کی معنی و تفسیر

......زمین کے نغمے

کمالِ صدق سے سوگند کھا کے کہتا ہوں
کہ یہ زمیں ہے بھرپور بھی، مکمل بھی
تمام عورتوں، مردوں کی چشمِ بینا میں
بذاتِ خود جو زمیں کی طرح مکمل ہوں

زمیں ان کے لئے کھردری شکستہ ہے
جو اپنی ذات میں ہوں ریزہ ریزہ ناہموار
نہ ایسی کوئی بھی طاقت، نہ کوئی عظمت ہے،
جو اتباع نہ کرتی ہو خاکِ گیتی کا

نہ کوئی نظریہ ہوتا ہے مستند جب تک
زمین کی اسے موزونیت نہ حاصل ہو

مصائبِ زیست میں خطرات کے تلاطم میں
مخالفت کی، تشدد کی تیز آندھی میں
کہ لمحے ٹھہر سے جاتے ہیں وقت ٹلتا نہیں
رہے وہ کس طرح اِک دوسرے کے پشت پناہ

ادھیڑ پن میں، جوانی میں اور پیری میں
رفیق کیسے رہے، کیسے جاں نثار رہے؟
میں جب یہ سنتا ہوں تو تلملا سا جاتا ہوں
وفورِ رشک سے دل میرا پھنکنے لگتا ہے
حسد کی آگ سے جلتا ہے میرا ہر بُن مو
بڑھانے لگتا ہوں میں تیز تیز اپنے قدم

"حسد کی آگ سے جلتا ہے میرا ہر بنِ مو"

وہ ہیرو رفعت و شہرت ہو جس کے زیر قدم
عظیم فتح سے ہو بہرہ ور وہ میر سپاہ
جو غور کرتا ہوں میں انکی داستانوں پر
تو کوئی شے نہیں ملتی کہ جس پہ رشک کروں

نہ صدر مملکت کو دیکھ کر میں کڑھتا ہوں
نہ رشک آتا ہے اس صاحبِ امارت پر
جو طمطراق سے اونچے محل میں رہتا ہو

وفا کا ذکر مگر جب کبھی بھی آتا ہے
یہ سنتا جب ہوں کہ کسطرح سے محبت میں
وفا پرستوں نے اک دوسرے کا ساتھ دیا

تم سے

اجنبی! مجھ سے اگر
برسرِ راہ گذر
تو ملے
اور تخاطب کے لئے
تیرے سینے میں کوئی آرزو انگڑائی لے
کیوں نہ تو بات کرے؟
کیوں نہ میں بات کروں؟

تم اپنے آپ کو کیا مری نذر کر دو گے؟
ہاں! پاس آؤ گے اور میرے ہمسفر ہو گے؟
نبھا سکیں گے رفاقت کو تا حیات ہم تم؟

وہ روپیہ کہ کمایا نہیں گیا اب تک
نہ اسکی فکر کرو اس سے بے نیاز رہو

جو مدرسے ہیں انھیں اپنا کام کرنے دو
اساتذہ کے نہ شور و شغب پہ کان دھرو
ہاں وعظ کہنے دو واعظ کو برسرِ منبر
عدالتوں میں وکیلوں کو بحث کرنے دو
ججوں کو چھوڑو کہ آئین کی شرح کرتے رہیں

تمہارے ہاتھ میں میں دے رہا ہوں اپنا ہاتھ
مرے رفیق رفاقت کی قدر لازم ہے
میں دے رہا ہوں تمہیں اپنا جذبۂ الفت
جو ڈیپے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اے دوست
صلے میں وعظ اور آئین کے بقلب صمیم
تمہیں میں دیتا ہوں خود اپنے آپ کو ہمدم

"مرے رفیق رفاقت کی قدر لازم ہے"

ہمارے سامنے جو شاہراہ ہے ایلنس
سلامتی و تحفظ کی وہ ضمانت ہے
یہ جادہ وہ ہے جسے ہم نے آزمایا ہے
یہ راہ وہ ہے کہ قدموں نے خوب دیکھا ہے
نہ ٹھہرو تم کسی قیمت پہ، مرے ساتھ چلو

وہ کاغذات کہ لکھے نہیں گئے اب تک
انھیں تو میز پہ رہنے دو بے لکھا یوں ہی
کتاب طاق پہ رکھی ہوئی ہے رہنے دو
اگرچہ اس کو کسی نے کبھی نہ کھولا ہو
جو کارخانے میں اوزار ہیں تو رہنے دو

خواہ کتنا ہی ہو ایثار کا جذبہ اس میں
بہرہ ور ہونے کی اس ذوق ضیافت سے مگر
چند لمحوں کے لئے ہم کو اجازت ہے فقط

حوصلے پست نہ ہوں تیز کرو تابِ نظر
عزم کے ساتھ چلو جاری رکھو اپنا سفر
راہ میں قدس کے آثار ملیں گے پنہاں
یہ یقیں تم کو دلاتا ہوں میں کھا کر سوگند
کہ ہیں آثارِ قدس حسن میں یوں ڈوبے ہوئے
جن کی تشریح سے الفاظ ہیں یکسر قاصر
ہم کہیں رک نہیں سکتے کسی نوع سے ایلنس!

خواہ اندوختہ ہو کتنا ہی مرغوب نظر
عافیت بخش ہو خواہ کتنی ہی یہ جائے قیام
اس جگہ ہم کسی قیمت پہ ٹھہر سکتے نہیں
کتنی ہی مامون و محفوظ ہو یہ بندرگاہ
اور پانی میں سمندر کے ہو جتنا بھی سکوں
ہم کسی حال میں لنگر نہ گرائیں گے یہاں

ہم کو مہمانی کی راحت جو میسر ہے یہاں

ہم سفر سے

کون ہو، کیا ہو، مجھے اِس سے سروکار نہیں
آؤ ایلینیس کہ کریں ساتھ سفر ہم دونوں
راہ میں پاؤ گے تم اتنی انوکھی چیزیں
جنکا واماندگی سے دور کا رشتہ بھی نہیں

یہ زمیں نظروں کو واماندہ نہیں کر سکتی
تم کو آئے گی نظر پہلے پہل یوں یہ زمیں
جیسے بے وضع ہو، خاموش ہو، ادراک سے دور
اور فطرت بھی نظر آئے گی یوں ہی جیسے
ناتراشیدہ سی ہو، فہم کی سرحد سے پرے

جذبِ کشش

میں ہی تو ہوں جسکے سینے میں تپش اندوز ہے
روئے جاناں کی دمک، دردِ محبّت کی خلش
کیا زمیں تپتی نہیں جذبِ کشش کے سوز سے
کیا تمام اجرام دردِ شوق کی تاثیر سے
کھنچتے ہیں یا نہیں اک دوسرے کو اپنی سمت؟
ہے یہ اپنا جسم بھی تو تابعِ سحرِ کشش
مل چکا ہوں جس کسی سے آشنا جس سے بھی ہوں
خود بخود پیہم کھنچا جاتا ہے جسم اس کی طرف

ریاستوں کے نام

تمام ریاستیں یا ان میں سے کوئی ریاست
کوئی بھی شہر یا قصبہ کسی ریاست کا
ہر اک کے نام ہے میرا یہ مخلصانہ پیام
اطاعت کم ہی کرو اور مزاحمت زیادہ
کسی بھی قاعدہ، قانون کی اگر اک بار
بغیر نقص شناسی کے پیروی کی جائے
تو قوم بنتی ہے اس سے غلام پختہ کار
کوئی بھی قوم ہو یا شہر یا ریاست ہو
جو اک بار بھی خوگر بنے غلامی کی
تو مل سکے گی اِسے حشر تک نہ آزادی

ہاتھ سے ہاتھ چھڑا لیتے کبھی ہم دونوں
پھر اسی جذبِ محبّت کا سہارا لے کر
اس نے پھر ہاتھ دبایا مرا اصرار کے ساتھ
"مجھ سے تم دور نہ ہو، آؤ مرے ساتھ رہو"
آج بھی دیکھتا ہوں میں اسے اس عالم میں
کہ مرے پاس کھڑی ہے لبِ خاموش کے ساتھ
پیکرِ حزن بنی، کانپتی تھراتی ہوئی

جیسے بھولا ہوا قصہ ہو، یا گم گشتہ خیال
گو مرے ذہن کو اس شہر سے کچھ ربط نہیں
بات اِک ایسی ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں
اور وہ بات اسی شہر سے وابستہ ہے

یاد آتا ہے، اسی شہر کی اِک عورت نے
روک رکھا تھا مجھے کیونکہ محبت تھی اسے
شہر کو بھول گیا، اس کو نہ میں بھول سکا
دن گذرتے گئے اور جذبۂ باہم کی بنا
پختہ تر ہوتی گئی صبح اور ہر شام کے ساتھ
قرب باہم کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہی

محو ہوئی جاتی ہے گو حافظے سے شہر کی بات
غرق تھی جذبۂ الفت میں مگر وہ عورت
جو مری ذات میں پیوستہ ہوئی جاتی تھی
ہم کبھی شوق کے جذبے میں بہک جاتے تھے

اِک دفعہ میں کسی گنجان شہر سے گذرا

اِک دفعہ میں کسی گنجان شہر سے گذرا
ایک رونق تھی عیاں شہر کے بام و در سے
فنِ تعمیر کی تابندہ مثالیں دیکھیں
شہر کی رسم و روایات بھی تھیں پیشِ نظر
مری آنکھوں نے اس انداز سے سب کچھ دیکھا
کہ مرے ذہن میں باقی رہے ہر چیز کا نقش
تاکہ اس نقش سے کچھ کام لوں آگے چل کر

اب جو کرتا ہوں نظر ذہن کے تہ خانوں پر
تو وہاں نقش کسی چیز کا موجود نہیں
شہر کی یاد دھندلکے میں یوں پیوست ہوئی

مرے لئے ہے یہ دن آیتِ خداوندی
ہر ایک لمحہ، ہر ایک پل، ہر اک ساعت
تجلیات کا کچھ حصہ دیکھ لیتا ہوں

خدا کو دیکھتا ہوں مرد و زن کے چہروں پر
اور آئینے میں جو آتی ہے اپنی شکل نظر
وہاں بھی دیکھتا ہوں میں اسی کو جلوہ نما

سڑک پہ ملتے ہیں مجھکو خدا کے وہ مکتوب
کہ جن پہ ثبت ہیں دستخط خدا کے نام کے ساتھ
میں چھوڑ دیتا ہوں اُنکو جہاں وہ ملتے ہیں
یہ جانتے ہوئے پہنچونگا جس مقام پہ بھی
ہمیشہ آتے رہیں گے خطوط وقت کے ساتھ

کسی بھی مرد یا عورت سے میں یہ کہتا ہوں
کہ اپنی روح کو شاداب و مجتمع رکھو
اگرچہ سامنے لاکھوں کروڑوں دنیا ہوں

تمام نوع بشر سے میں عرض کرتا ہوں
خدا کی ذات کے بارے میں جستجو کیسی ؟
خدا کی ذات کے بارے میں سوچنے کے عوض
میں آدمی کو بناتا ہوں فکر کا مرکز

خدا اور موت کے بارے میں مطمئن ہوں میں
مرے یقین نے بخشا ہے وہ سکوں مجھ کو
کہ جس کی شرح زبان و بیاں کے بس میں نہیں

خدا کو دیکھتا سنتا تو ہوں ہر اک شے میں
مگر سمجھ میں نہ آیا کہ اسکی ذات ہے کیا
نہ آیا یہ بھی سمجھ میں کہ میری ذات سے بھی
کسی کی ذات میں زیادہ ہے حیرت و عظمت

خدا کو دیکھنے کی آرزو میں کیا کرتا

ہم اور تم ہوں تہی جیب پھر بھی کیا غم ہے
کہ بے زری کو فراخیٔ دل سے کیا نسبت
خرید سکتے ہیں دنیا کی منتخب اشیاء

تمام علم تمام آگہی کو حیرت ہے
کہ کس طرح سے نئی کونپلیں نکلتی ہیں
پھر ان میں کس طرح لگتی ہیں دانے کی پھلیاں

نہ کوئی پیشہ ہے ایسا، نہ روزگار کوئی
کہ نوجوان کوئی اس سے منسلک رہ کر
بزعم خویش یہ سمجھے کہ میں بھی ہیرو ہوں

یہ کارخانہ ہستی جو اپنے پہیوں پر
رواں دواں ہے تسلسل کے ساتھ ہر ساعت
نہیں ہے کوئی بھی شے اتنی نرم اور نازک
کہ کارخانے کا پرزہ بنے بہ آسانی

خدا کے مکتوب شاعر کے نام

ہے جسم و روح کے بارے میں فیصلہ میرا
نہیں ہے روح کوئی چیز جسم سے بڑھ کر
اسی طرح سے نہیں جسم روح سے افضل
کسی بھی فرد کے نزدیک اسکی اپنی ذات
نہیں ذرا سی بھی کم تر خدا کی ذات سے بھی

وہ راہرو کہ ہو نا آشنائے ہمدردی
نہ چل سکے گا کبھی شاہراہ منزل پر
اگر چلا بھی دو اک گام لڑکھڑاتا ہوا
تو اس طرح سے چلے گا کہ جیسے جائے کوئی
کفن میں لپٹا ہوا اپنی گور کی جانب

میں دیکھتا ہوں سمندر میں راستہ کھو کر
کوئی جہاز ہوا قحطِ جاں ستاں کا شکار
جہازرانوں نے پھر قرعہ ڈال کر دیکھا
کہ کس کو ذبح کیا جائے دوسروں کے لئے

مرے مشاہدے میں ہیں وہ اہلِ کبر و غرور
جو ظلم کرتے ہیں محنت کشوں، غریبوں پر
جو حبشیوں پہ، ضعیفوں پہ، خستہ حالوں پہ
حقارت اور تظلم کو حق سمجھتے ہیں

میں بیٹھا دیکھتا رہتا ہوں آنکھ سے سب کچھ
یہ پستی اور خلش جس کا اختتام نہیں
میں دیکھ سن کے بھی یکسر خموش رہتا ہوں

وفورِ غم سے بدن جن کا سوکھ جاتا ہے
جو بپھری رہتی ہیں رنج والم کی شدت سے

میں دیکھتا ہوں وہ نازیبا، نا روا برتاؤ
روا جو رکھتا ہے خاوند اپنی بیوی پر
میں دیکھتا ہوں جہاں دیدہ جعلسازوں کو
جوان عورتوں کو دام میں جو لاتے ہیں

مری نگاہ میں ہے وہ فشار اور جلن
حسد کی تنگ نگاہی سے جو ابھرتی ہے
مری نظر میں ہے انجام اس محبت کا
جسے کسی نے سراہا نہ جس کی داد ملی
ہمیشہ ہوتی رہتی جس کے دفن کی تدبیر

وبائیں، ظلم و ستم اور جنگ کی وحشت
میں دیکھتا ہوں شہیدوں کو، اہل زنداں کو

"میں بیٹھا دیکھتا ہوں ساری کائنات کا غم"

میں بیٹھا دیکھتا ہوں ساری کائنات کا غم
مری نظر میں ہے روداد ظلم و ذلت کی
وہ جاں گداز و جگر سوز ہچکیاں جن کو
میسر آتی نہیں کوئی صورت اظہار
جو نوجوانوں کو رکھتی ہیں مبتلائے خلش
کسی بھی کار ندامت کے ارتکاب کے بعد
میں سنتا رہتا ہوں ان ہچکیوں کی آوازیں

مری نظر میں ہے ان دکھیا ماؤں کی بپتا
جو اپنے بچوں کی بیدرد کج سلوکی سے
دلوں میں کڑھتی ہیں اور خستہ حال رہتی ہیں
جو کس مپرسی کے عالم میں جان دیتی ہیں

عورتیں

کچھ عورتیں ہیں کہ بیٹھی ہوئی ہیں اپنی جگہ
کچھ ایسی ہیں کہ خراماں ہیں ایس آن جانب
کچھ عورتیں ہیں جواں سال اور کچھ بوڑھی
جو نوجوان ہیں وہ کتنی خوبصورت ہیں!
مگر جو بوڑھی ہیں وہ ان جواں سالوں سے
نہ عمر ہی میں فقط حسن میں بھی آگے ہیں

عالمِ پیری

کچھ ایسا لگتا ہے مجھ کو یہ عالم پیری
کہ ایک ندّی کا جیسے کوئی دِھانا ہو
کسی عظیم سمندر سے اتصال کے وقت
تصورات میں عظمت کا اِک شعور لئے
جو گنگناتا ہوا بڑھتا پھیلتا جائے

زبانیں اِن کی ہیں گو مختلف مگر ان سے
میں اپنے آپ کو اتنا قریب پاتا ہوں
کہ جیسے میرے ہی اہلِ وطن ہیں وہ سب لوگ

خوشا یہ جذبۂ باہم کہ بُعد ختم ہوا
یقین ہے کہ ہمارے دلوں کی ہر دھڑکن
پیام دیتی ہے اِک دوسرے کو اُلفت کا
ہے اطمینان کہ میں ان کے درمیاں رہ کر
گذار دوں گا مسرت میں زندگی اپنی

قربت

خوشا یہ لمحہ کہ بیٹھا ہوا ہوں میں خاموش
وفورِ شوق سے سرشار اپنی فکر میں گم
کچھ ایسا لگتا ہے مجھ کو کہ دور ملکوں میں
ہیں میری طرح سے کچھ لوگ اس گھڑی بیٹھے
نیازِ شوق میں گم، اپنی فکر میں ڈوبے

میں دیکھتا ہوں کہ وہ سر بجیب بیٹھے ہیں
فرانس، جرمنی، ہسپانیہ اور اٹلی میں
یہ ہمنجتی ہے جو نظر اور دور ملکوں میں
تو دیکھتا ہوں کہ جاپان روس چین میں بھی
خموش بیٹھے ہیں کچھ لوگ اپنی فکر میں محو

نہ ایسی کوئی بھی تصنیف ہوگی میرے بعد
کسی کتاب کی الماری کی جو زینت ہو
میں چھوڑ جاؤں گا وہ چند گیت ورثے میں
ہمیشہ جن کا ترنم فضا میں گونجے گا
سرورِ خاطرِ یارانِ قدرداں کے لئے

یارانِ قدرداں کیلئے

بنا نہ میں کسی ایسی مشین کا موجد
کہ جس سے ختم ہوا مکاں مزد و محنت کا
نہ میرے حصّے میں آئی وہ فکر کی جودت
کسی بھی شعبے میں کرتا میں انکشاف کوئی
نہ اِس کا اہل ہوں کہ اپنے بعد چھوڑ سکوں
کوئی اثاثہ کہ جس کی بنا پہ ہو تعمیر
رفاہ کے لئے دار الشفاء، کتب خانہ
نہ چھوڑ جاؤں گا روداد عزم و ہمت کی
کہ جس کو اِک نمونہ سمجھ لے امریکا
نہ چھوڑ جاؤں گا شہ پارۂ ادب کوئی
نہ دے سکوں گا بساطِ خرد کو میں کچھ بھی

لہریں

جس جگہ بھی ہو، جہاں بھی ہو، تو موجود وہیں
میں دبے پاؤں پہنچ جاتا ہوں اکثر اے دوست
تاکہ نزدیکی کی لذت سے نہ محروم رہوں
میں کبھی سامنے سے تیرے گذر جاتا ہوں
بیٹھ جاتا ہوں کبھی پہلو میں تیرے آکر
کبھی کمرے میں تیرے ساتھ رہا کرتا ہوں
میری وابستگیٔ دل کا تجھے علم نہیں
تجھے معلوم نہیں میری رگوں میں کتنی
شعلۂ برق کی لہریں ہیں رواں تیرے لئے؟

اگر نہ دیسکے ایسوں کو تم جگہ دل میں
رہے تمہاری محبّت بھی جنکے ساتھ اک راز
تو فائدہ تمہیں پہونچے گا کیا تلمذ کا
بنو گے کیسے میکر ایک نکتہ رس تلمیذ
اُمیّد رکھتے ہو کیا حلقۂ سخن سے میکر!

ایک نوجوان سے

جو اتنی باتوں پہ ڈالی ہے روشنی میں نے
محرک اس کا ہے بس ایک مدعا میرا
کہ اپنی ذات میں تم جذب کر لو نکتوں کو
سرورِ جذبِ معانی کی رہنمائی میں
بنو شعور سے ایک باصلاحیت شاگرد

لہو جو کرتا ہے گردش مرے رگ و پے میں
اگر تمہاری رگوں میں بھی موجزن نہ ہوا
کچھ اہلِ دل نہ اگر تم کو اِس طرح چاہیں
کہ اِن کا جذبۂ خاموش بے نقاب نہ ہو

زفرق تا بقدم جسم کے تمام اعضا
ہیں میری فکر کا مرکز، جنھیں میسّر ہے
تمام حسن و تجمل تمام رعبِ جمال
مری نظر میں مساوی ہیں مرد و زن دونوں
میں گیت گاتا ہوں اعضائے جسم انساں کا

میں گیت گاتا ہوں ایسی حیات کا جس میں
وفورِ جذب ہو، جوشش ہو، سرفرازی ہو
میں نغمہ خواں ہوں حیاتِ نشاط پرور کا
ہو جس میں سعی و عمل کی مکمل آزادی
مطیع ہو جو بہر حال آئینِ حق کی
میں گیت گاتا ہوں تازہ جدید انساں کا

"میں گیت گاتا ہوں اعضائے جسمِ انساں کا"

"کسی بھی فرد کی مخصوص اور تنہا ذات
اگرچہ لے ہے مرے سازِ نغمہ پرور کی
یہ ایک ذات مگر ترجمان ہوتی ہے
تمام لوگوں کی، جمہور کی زمانے کی"

ہر ایک عضوِ بدن سر سے تا قدم یکسر
مرے سخن میں دمکتا ہے مہر و مہ بن کر
نقوشِ چہرۂ انساں یا محض اس کا دماغ
نہیں ہے عنصرِ غالب ہمارے گیتوں کا

سب سے بڑھ کر قدر یہاں تھی
جذبۂ دل کی ، جنسِ وفا کی
ہر جذبے کی راہنما ...... تھی
جذبِ محبت کی رعنائی
ہر شہری کے فکر و عمل سے
ہوتی تھی ہر لحظہ نمایاں
شوقِ محبّت کی جولانی
آنکھوں میں تھی مہر و مروّت
باتوں سے تھا پیار ٹپکتا
رات یہ ہم نے سپنا دیکھا

شہر احباب

رات یہ ہم نے سپنا دیکھا
ایک نرالا شہر بسا ہے
اتنا پختہ اور مستحکم
ساری دنیا کی یورش بھی
جس کو زیر نہ کر سکتی تھی
فتح و ظفر تھا اس کا حصّہ
شہر نو احباب کا تھا یہ

میں شکوہ سنج نہیں داغ نامرادی کا
اسی کی دین ہے میرا کمالِ نغمہ گری
اسی کی چاندنی میں میں نے کتنے گیت لکھے

بصد خلوص، بصد اشتیاق میں نے کبھی
کسی سے اپنی محبت کی داد چاہی تھی
صلے میں پایا ہے میں نے شعورِ محرومی
گذشتہ تجربے مجھکو یقین دلاتے ہیں
بہائے ذوق محبت ہے اسکی بے قدری
وفا کی گرمیٔ بازار بے حقیقت ہے

درونِ سینہ مگر روشنی کی کچھ لہریں
سوادِ دیدہ و دل کا محاصرہ کر کے
سیاہ روئی سے افکار کو بچاتی ہیں
لبِ سروش سے آتا ہے یہ پیام آخر
نشاطِ ذوقِ وفا ہے، بہائے ذوقِ وفا
دلوں کا ربط کبھی بے صلہ نہیں ہوتا

نشاطِ غم
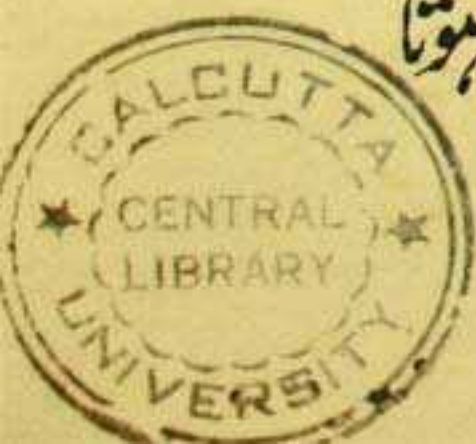
نیا نیا کہیں ہوتا ہے دل جو وابستہ
اُمنگیں نرم و حسین خواب بننے لگتی ہیں
شعور جذب محبت میں ڈوب جاتا ہے

یہ لطف و کیف تسلسل مگر نہیں رکھتا
تراش لیتی ہے افسردگی تخیل ...... کی
کسی بہانے سے تشکیک کا کوئی پہلو
نیاز شوق کا رخ زرد پڑنے لگتا ہے

تصورات میں یکسر ابھرنے لگتے ہیں
نقوش حسرت خوں گشتہ، داغِ ناکامی
اسیر ذہن کو کرتی ہے تلخیٔ احساس
میں اپنے کرب کی دنیا میں کھو سا جاتا ہوں

مرے آداب رواداری سے کچھ دور، پرے
کیا تمہیں اور کوئی شے نظر آتی ہی نہیں ؟
تم بڑھے جاتے ہو جس راہ پر ایقان کے ساتھ
اسمیں مل جائیگا کیا تم حقیقی ہیرو؟
خواب سے چونکو ذرا، ہوش میں آؤ تو سہی
یہ نگاہوں کا کرشمہ ہے یا مایا تو نہیں ؟

"تم مری چاہنے والوں میں نئے ہو شاید"

بے تکلف جو کھنچے آتے ہو مری جانب
تم مرے چاہنے والوں میں نئے ہو شاید
ابھی آغاز ہے تاکید کئے دیتا ہوں
کہ مری شکل کو اس نقش سے کچھ ربط نہیں
تم نے جو اپنے تصور میں سجا رکھا ہے
تم کو مل جائیگا کیا مجھ میں مثالی کردار

اتنا آسان نہ سمجھو کہ تمہیں دل دیدوں
کیا سمجھتے ہو کہ یہ دوستی راحت کے سوا
اپنے دامن میں نہ رکھے گی کوئی سوز خلش
معتمد اور وفادار سمجھتے ہو مجھے؟
مرے کردار کی ہموار سطح سے آگے

مرے شعور میں رس بس گئے ہیں یہ عنواں
انھیں کے گرد مری فکر رقص کرتی ہے
سرور و کیف کا ماخذ ہیں گویا یہ موضوع
کہ میرے گیتوں میں تکرار ان کی ہوتی ہے
مشاہدات کی دنیا میں یہ تھا پہلا قدم

شعورِ محض کے پردے پہ رنگ و بو کے نقوش
زمین چاند اور اجرام کا طلسمِ کشش
ہوا کے دوش پہ پرواز کرنیوالے طیور
زمیں کی گود میں جو پل رہے ہیں چوپائے
حقیر کیڑے جنھیں خاک راس آتی ہے
تمام وسعتیں گم جس میں ہوں وہ بینائی
سرورِ سازِ محبت، وفورِ جوشِ حیات
مشاہدے کے لئے یہ ملے تھے عنوانات

فسون و سحر میں ڈوبے ہوئے حقائق نے
دل و نگاہ کو کچھ اس طرح اسیر کیا
کہ اپنے پہلے ہی نقشِ قدم کی مٹھی میں
سمٹ کے آ گئی منزل مرے تصور کی
میں آگے جاتا بھی کیسے کہ دل یہ کہتا تھا
یہیں رہو اسی منزل پہ بامراد رہو

پہلا قدم

مشاہدات کی دنیا کی بیکراں وسعت
قدم قدم پہ جہاں عظمتوں کی قندیلیں
دلوں کو کھینچتی، آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں
جب اس دیار کی جانب بڑھا تھا پہلا قدم
ہمارے سامنے اِک پروقار ہیبت تھی
جمالِ قدس سے لبریز ایک حیرت تھی

نصیب جاگے بنا خضرِ شوق راہنما
نظر کو تاب ملی، دل نے حوصلے پائے
نگاہ چند ہی نقطوں کی ہو گئی پابند
کسی کے عارض و گیسو کی جیسے پہلی جھلک
دل و نظر کے لئے نقش پائدار بنے
مشاہدوں کے لئے چشمِ دل ہوئی بیدار

نہیں ذرا سی بھی کم تر خدا کی ذات سے

ڈی۔ ایچ لارنس نے ان کے بارے میں کہا تھا "تمام شعرا سے آگے زندگی کی نئی شاہراہوں کا رہبر وہٹمین اس کے آگے کوئی نہیں"۔ اس کے باوجود وہ اپنی ایک نظم میں بڑے انکسار کے ساتھ کہتے ہیں "میں اپنے بعد عزم و ہمت کی کوئی ایسی روئداد نہیں چھوڑ جاؤں گا جو مرے ہم وطنوں کے لئے باعث افتخار ہو اور نہ مرے بعد کوئی شہ پارۂ ادب ہو گا جو کسی الماری کی زینت بنے بلکہ

میں چھوڑ جاؤں گا وہ چند گیت ورثے میں
ہمیشہ جن کا ترنم فضا میں گونجے گا
سرورِ خاطرِ یارانِ قدرداں کے لئے

"شعر و شاعری کے مطالعہ کرنے والوں کی نظر جب گاؤں کی فیکٹروں اور ریلوے پر پڑتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ کھلے ہوئے میدانوں کی شعریت مجروح اور شکستہ ہوگئی۔ ان کی اس مایوسی کا سبب یہ ہے کہ ابتک مشینیں دنیائے شعر میں داخل نہیں ہوئیں لیکن شاعر کائناتی نظام میں مشینوں کی اہمیت کا بھی اندازہ کرتا ہے اور اس کی نظریں مشینوں میں بھی اس فنکارانہ حسن کا مشاہدہ کرلیتی ہیں جو شہد کے چھتے یا مکڑی کے جالے میں نمایاں ہوتا ہے۔"

ٹکنولوجی کی مدح کرتے ہوئے وہ MUSE سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ پرانی دنیا کو خیر باد کہہ کر "مقدس صنعت" کے عظیم کلیسا میں آباد ہوجائے۔

والٹ کو عظیم بننے کا ہوکا نہیں تھا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ اپنی پیدائش سے لے کر آج تک کوئی شاعر اِن کے مرتبے کا پیش نہیں کرسکا اور یہ کہ ۱۹ ویں صدی نے جتنے عظیم فنکاروں اور شاعروں کو جنم دیا۔ وہٹ مین کی حیثیت بہر حال ان میں سے کسی سے کم نہیں۔ فکر و نظر اور جذب و جنون کی جن وادیوں سے ہر صدی اور ہر دور کے عظیم رہنمایانِ فن گذر چکے ہیں والٹ نے ان تمام وادیوں کو طے کیا اور اس انداز سے کہ ذہن میں فوق البشر بننے کا زعم نہیں پیدا ہوا، بلکہ وہ اپنے ہم جنسوں کی خودی اور ان کا احترام کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کسی بھی فرد کے نزدیک اسکی اپنی ذات،

ہے کہ وہ شہریوں کو بڑھنے کا اور پھیلنے کا موقع دے ۔ یہ نہیں کہ ان کی آزادی سلب کرلے ۔"

سرمایہ داروں پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا سرمایہ داری ایک بیماری کا نام ہے جس کا مریض ہر چیز کو اپنی ذاتی ملکیت بنانا چاہتا ہے ۔"

وہ عورتوں کی آزادی اور عظمت کے قائل تھے ۔ اپنی نظموں میں انھوں نے بتایا ہے کہ عظیم شہر وہ ہے جہاں مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی اپنے حقوق کے لئے جلوس نکالیں ۔ پبلک جلسوں میں انھیں وہی مقام حاصل ہو جو مردوں کو حاصل ہے ۔ وہ مردوں کے پیشے بھی اختیار کر سکتی ہیں لیکن اس تمام آزادی کے باوجود انھیں اپنی نسوانیت سے دست بردار نہیں ہونا چاہئے ۔ وہ ایسے فیشن کے روادار نہیں تھے جس سے عورتوں کی نسوانیت کو صدمہ پہنچے ۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتیں صحت مند بچوں کی مائیں بننے کی صلاحیت ہرگز نہ کھوئیں ۔ ان کی نظر میں عورتیں اتنی ہی محترم ہیں جتنے مرد ۔

اپنے عہد کی بڑھتی ہوئی صنعت اور مشینوں کی ایجاد سے وٹمین پریشان نہیں تھے ۔ وہ صنعتی دور کو شاعری کے لئے خطرہ سمجھنے کے بجائے اس بات کے موید تھے کہ صنعت اور شاعری کو ایک دوسرے میں پیوست ہونا چاہئے ۔ اپنی نظموں میں فیکٹریوں میں استعمال ہونے والی بہت ساری کلوں اور پرزوں کا ذکر کیا ہے ۔ الیکٹرک ٹیلیگراف اور لوہے کی کانوں کو "سیاہ نظموں" اور اسٹیم جہاز، ٹرین وغیرہ کو "شاندار نظموں" سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اپنے ایک مضمون میں اس امر کی وضاحت اس طرح کی ہے ۔

اس پر نکتہ چینی کرنا، خلاف ورزی کرنا اور بغاوت کرنا"۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی کو ہمیشہ اصلاح پسندوں اور انقلابیوں کی ضرورت رہے گی آئین فرسودہ ہو کر اپنے معنے کھوتے رہتے ہیں۔ ایسے میں اصلاح و انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ نطشے کے فوق البشر اور کارلائل کی ہیرو پرستی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ سیاحوں، نئی چیزیں ڈھونڈھنے والوں، انجینیروں، معماروں اور مشین پر کام کرنے والوں کو ہیرو سمجھتے تھے۔ لنکن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں نوع انسانی کا رہنما ہی نہیں بلکہ "بشریت کا نمائندہ" بتایا ہے۔ ایمرسن کے لفظوں میں نمائندگی بشر سے مراد وہ صفتیں ہیں جو اوسط درجے کے آدمیوں میں پائی جاتی ہوں اور نمائندہ بشر جو ان صفتوں سے متصف ہوتا ہے۔ اسے اقتدار مذموم نہیں کرسکتا۔ جمہوریت ان کے نزدیک کسی ایسی حکومت کا نام نہیں جو بہترین انسانوں پر مشتمل ہو جو ہیرو کی اولاد ہوں بلکہ اس سے ان کی مراد ایسی حکومت ہے جو اپنے شہریوں کو مساوی حقوق عطا کرنے کے بعد انھیں اپنے آپ پر حکومت کرنا سکھاتی ہو۔

۲۰ ویں صدی میں برٹرنڈ رسل اپنے ہم عصروں سے کہتے ہیں کہ کوئی سوسائٹی عظیم نہیں ہو سکتی جب تک اس میں عظیم افراد نہ ہوں۔ لیکن ۱۹ ویں صدی کے وسط میں ایک شاعر یعنی وٹمین نے اعلان کیا "ہمیں عظیم افراد یا عظیم رہنماؤں کی ضرورت نہیں، ہم اجتماعی عظمت چاہتے ہیں ایسی عظمت جو بے نظیر ہو۔"

حکومت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے امریکی عوام سے کہا امریکی صدر وہائٹ ہاؤس میں تمہارے لئے بیٹھا ہے، تم اس کے لئے نہیں ہو۔ حکومت کا فرض

پیشتر اپنی پسند کے مطابق اپنا مقبرہ خود تعمیر کروالیا تھا اور اپنے پس ماندوں کے لئے چھ ہزار پونڈ کی رقم چھوڑی۔

سیاسی اور سماجی افکار

ایک عام امریکی کی طرح انھیں بھی اپنے وطن سے محبت تھی۔ وطن کی سرزمین اس کے فطری مناظر، عوام اور قومی تحریکوں سے وہ گہری وابستگی رکھتے تھے لیکن شعور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس وابستگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور امریکی قومیت کا دائرہ پھیل کر بین الاقوامی بن گیا۔

دراصل ان کی فکر و نظر کی اساس ۱۸ ویں صدی کی حریت فکر پر قائم تھی، جو ۱۹ ویں صدی کے یورپ میں تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی انقلابات کا پیش خیمہ بنی۔ والٹ نے عظیم مفکرین کے نظریات کو اپنی ذات میں جذب کیا اور جب اپنی شاعری اور مضامین کے ذریعے ان جذب کئے ہوئے نظریات کو عوام کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو ان میں ان کی انفرادیت کی جھلک تھی، ندرت تھی گویا ان کے ذہن کے سانچے میں ڈھل کر تمام افکار ان کی ذات سے منسوب ہو چکے تھے۔ تاریخ، حکومت، ریاست، سب کے بارے میں نئی باتیں کہیں جن کا مقصد آزادیٔ فکر پیدا کرنا اور انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرنا تھا۔

"تاریخ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ تاریخ تشدد اور آزادی کے درمیان ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہے۔ کبھی کبھی تشدد کی جیت ہوتی ہے لیکن اس جیت میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ آزادی بہرحال ایک نہ ختم ہونے والی چیز ہے"۔

حکومت کا کام ہے احکام نافذ کرنا۔ شاعر اور ذہین لوگوں کا کام ہے

اور ان پر امرد پرستی کا الزام تراشا. پتہ نہیں ان کے نقادوں اور سوانح نگاروں میں یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی ؟ بعض نوجوانوں کے نام انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں اپنی پدرانہ شفقت کا اظہار کیا ہے اور نوجوان دوستوں کو فرزندِ عزیز کہہ کر مخاطب کیا ہے

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں اور میر عبدالحی تاباں کے گہرے مراسم کا ذکر جس شگفتہ انداز میں کیا ہے اِسے سامنے رکھ کر وٹیمن کی پاکیزگیِ نظر کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عمر بھر ان کی طرزِ فکر میں ایک تناسب اور یکسانیت باقی رہی۔ بڑھاپے میں بھی وہی ترانے الاپے جو جوانی میں الاپ چکے تھے. فرق صرف اتنا تھا کہ کلام میں عہدِ شباب کی شدت نہیں رہی۔

زندگی اور موت کے بارے میں بہت کچھ سوچا۔ ویدانت کی طرف رجوع کیا آواگون پر اعتقاد رکھا۔ یہ بھی سوچا کہ اوتار بن کر پھر اس عالم میں آؤں گا۔ لیکن بڑھاپے میں جب قویٰ مضمحل ہو گئے۔ طرح طرح کی بیماریوں نے آگھیرا تو بار بار پیدا ہونے کا تصور کچھ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوا۔ ایک غیر مادی جسم کے ساتھ باقی رہنا زیادہ پسند آیا۔

ان کا تعلق کوئیکرز نام کی ایک آزاد مذہبی جماعت سے تھا جس کے وہ رہنما نہیں بلکہ ایک معمولی رکن تھے. ۱۸۹۲ء میں کامڈن کے مقام پر ان کا انتقال ہوا ان کے جنازے میں افلاطون اور مہاتما گوتم بدھ کی کتابوں سے اقتباسات پڑھے گئے اور بائبل، ژند آوستا اور قرآن کی تلاوت کی گئی۔ جنازے میں عوام کا ایک اژدہام تھا جن میں اِن کے کالے اور گورے بچے اور ان کی مائیں شریک تھیں۔ مرنے سے

مستقبل میں ماضی سے بھی عظیم تر شاعر پیدا ہوں گے۔ ان شاعروں میں
مذہب کی گرمجوشی کے ساتھ ہیگل کے نکات اور ہم عصر سائنس کی جدتیں ہونگی۔
جو دنیا پیدا ہونے والی ہے وہ زیادہ شاندار ہوگی۔ اس میں خطیب ہوں
گے، شاعر ہوں گے ـــــ مجھ سے بھی عظیم تر"۔
ادب ایک عظیم فن ہے جو آگے چل کر مذہب کا بدل بن جائے گا"۔

ایک ضروری ہدایت

"صحت کے بغیر شخصیت میں کشش نہیں پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ شعر و
شاعری بھی ممکن نہیں۔ شاعر بننے کے لئے ضروری ہے کہ ترک ہوس
کی جائے۔ دولت نہ فراہم کی جائے۔ اکتساب سے جو کامیابی بھی حاصل
ہو اسے دونوں ہاتھوں سے بانٹا جائے۔ ہر وہ چیز جو موجود ہے اس میں
حُسن ہے۔"

والٹ ویٹ مین بعض نوجوانوں سے بہت قریب تھے۔ وہ انھیں بہت عزیز
رکھتے تھے۔ انھیں میں سے ایک بیس سالہ نوجوان پیٹر ڈائل (PETER DOYLE) تھا
وٹمین کو اس سے بے حد محبت تھی۔ اگرچہ وہ ایک ان پڑھ نوجوان تھا۔ لیکن دونوں کے
تعلقات بڑے گہرے تھے۔ وٹمین اس کی بڑی دلجوئی کرتے تھے۔ اسی طرح ڈائل بھی
ان پر جان نثار کرتا تھا۔ وٹمین جب بیمار رہوئے تو وہ برابر ان کی عیادت کرتا رہا
اسی طرح بعض اور نوجوان بھی تھے جن کی ذات سے وٹمین کو بے حد دلچسپی تھی۔
وہ ان سے شاعرانہ اور فلسفیانہ نکات پر گفتگو کرتے تھے اور انھیں روحانی اسرار
سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس مشرب کی بعض ہم عصروں نے غلط تاویل کی

آلات سے پرے ایک اور حقیقت ہے جہاں تک پہونچنے کے لئے ایک اور سائنس کی ضرورت ہے جسے وہ سائنس آف گاڈ (SCIENCE OF GOD) کہا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سائنس عہد وسطیٰ کے تمام توہمات کو ختم کر دے گی جو حقانیت پر مسلّط ہیں[1]۔

عیسائیت انھیں بے کیف اور پژمردہ معلوم ہونے لگی۔ مذہب کے باب میں ان کا رجحان باغیانہ شکل اختیار کرنے لگا۔ ۱۸۵۶ء میں ایمرسن کے نام ایک کھلی چٹھی میں اپنے عقائد کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"چرچ جھوٹ کا ایک طومار ہے۔ عوام اس پر یقین نہیں رکھتے اور چرچ کو خود اپنے اوپر یقین نہیں ہے۔ پادری بار بار وہ باتیں دہراتے ہیں جو خود ان کی دانست میں غلط ہیں۔"

مذہب کے سلسلے میں وہ ایک جگہ اور فرماتے ہیں:۔

"وہ دن دور نہیں جب پادریوں کا کہیں پتہ نہیں ہوگا۔ ان کا کام ختم ہو چکا ہے، وہ تھوڑی دیر تک توقف کر سکتے ہیں ـــ ایک یا دو نسلوں تک ـــ اس کے بعد تدریج وہ ختم ہو جائیں گے۔ ایک نئی نسل جو ان سے برتر ہوگی ان کی جگہ لے لیگی۔ ایک نیا نظام جنم لے گا جس میں ہر شخص اپنا پادری آپ ہوگا۔"

مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات کا کچھ اندازہ ذیل کی سطروں سے کیا جاسکتا ہے:

---

[1] THE EVOLUTION OF WHITMAN BY ROGER ASSELINEAU.

وٹمین سے ۲۲ سال عمر میں بڑے تھے) اور دونوں نے قسمت بھی تقریباً یکساں پائی تھی ۔ غالب نے بھی اپنی زندگی میں گالیاں سنیں اور وٹمین نے بھی ۔ دونوں کو مستقبل کے تصور نے سہارا دیا ۔

انسانی جسم کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے پرزور لفظوں میں کہا

I AM THE POET OF THE BODY AND

I AM THE POET OF THE SOUL.

(میں جسم کا شاعر ہوں میں روح کا شاعر ہوں)

مذہب کی ظاہر داری اور فرسودہ روایات سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی ، لیکن روحانی قدروں کے دل سے معترف تھے ۔ اور اکثر معرفت توحید میں غرق رہتے تھے ۔

خدا کو دیکھتا ہوں مرد و زن کے چہروں پر
اور آئینے میں جو آتی ہے اپنی شکل نظر
وہاں بھی دیکھتا ہوں میں اسی کو جلوہ نما

مسئلہ وحدت الوجود کا انھوں نے براہ راست مطالعہ کیا تھا یا نہیں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ، لیکن ذیل کی لائین غمازی کرتی ہے کہ وہ اس راہ سے ناآشنا نہیں تھے ۔

ALLAH IS ALL ALL ALL, ALLAH IS IMMANENT

IN EVERY LIFE AND OBJECT.

اپنی نظموں میں انھوں نے تلقین کی کہ سائنس کے نظریات اور

میں ایسے موضوع کو بھی جگہ دی جن کو انگریزی زبان کے شاعروں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ انسانی جسم کے حسن اور تقدس کا جو تصور ہمیں وٹمین کی نظموں میں ملتا ہے اس کی مثال انگریزی شاعری کی تاریخ میں جو ۱۲، ۱۳ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے نہیں ملتی۔ وٹمین جسم اور روح دونوں کا احترام کرتے ہیں بلکہ وہ جسم کو روح کا درجہ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں جسم کو جگہ دی۔

"میں گیت گاتا ہوں اعضائے جسم انساں کا"

ان کے یہاں ایک نئی قسم کی روحانیت ملتی ہے جسے مادی روحانیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ایک مقام پر اس نکتے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

"طبیعات کے خوبصورت اصولوں کے تحت روح جلوہ ریز ہوتی ہے۔ روح عظیم پاکیزہ اور لافانی ہے لیکن اس کا اظہار مادے کے ذریعے ہو سکتا ہے۔"

فکری اعتبار سے وہ غالب سے کتنے قریب ہیں اس ضمن میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

یہ محض اتفاق ہے یا حسن اتفاق کہ دونوں کا زمانہ تقریباً ایک ہے (غالب کا سن پیدائش ۱۷۹۷ء اور وٹمین کا ۱۸۱۹ء ہے۔ اس طرح مرزا غالب

۱۸۶۸ء میں لیوزآف گراس انگلینڈ میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اور نقادوں کے لئے عنوانِ بحث بن گئی۔ جنوبی اور شمالی ریاستوں کے درمیان ابطالِ غلامی کے مسئلے پر جو جنگ ہوئی اس میں ان کے بھائی جارج بری طرح زخمی ہوئے۔ وٹمن کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی۔ ان کی نظموں میں آفاقی قدروں کے علاوہ اب جنگ کی وحشت اور بربریت سے متعلق تاثرات داخل ہونے لگے۔ ۱۸۷۳ء میں بائیں جانب فالج گرا اور مصیبتوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے بعض احباب جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہونے لگے۔ والٹ کسی طرح اپنے بھائی جارج کے مکان پر آئے اور تادمِ اخیر یہیں مقیم رہے۔ ضعف اور بیماری کے باوجود شعر و شاعری کا شغل جاری رہا۔

لیوزآف گراس (LEAVES OF GRASS) اب کثیر تعداد میں فروخت ہونے لگی ہے اور اسکی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ خود ان کی زندگی میں دس بار شائع ہوئی۔ اسی اثناء میں ان کے بعض حاسدوں نے امرد پرستی اور فحاشی کے الزامات تراشے اور ڈسٹرکٹ اٹورنی بوسٹن (DISTRICT ATTORNEY BOSTON) کی عدالت سے اپیل کی کہ والٹ پر مقدمہ چلایا جائے اور ان کو مجبور کیا جائے کہ اپنی نظموں کے کچھ حصے محذوف کر دیں۔

وٹمین کی عظمت کا راز ان کی منفرد زبان اور جدتِ فکر میں پوشیدہ ہے جس کا صحیح اندازہ ان کے عہد کے نقاد نہیں کر سکے۔ انھوں نے اپنے نظامِ فکر

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور غلیظ خیالات کے ڈھیر میں سوروں کی طرح زمین کھرچ رہا ہے"۔ لندن کرٹیک نے ان کی نظموں کو بیہودہ بکواس سے تعبیر کیا۔۔۔ دیگر مصنفین یا تو خاموش رہے یا کتاب یوں ہی واپس کردی۔ بعضوں نے بڑے صبر اور استقامت سے کام لیا۔ دوسرے سال یعنی ۱۸۵۶ء میں انھوں نے اپنا مجموعہ دوسری بار شائع کیا اور اس میں ۲۰ مزید نظموں کا اضافہ کر دیا۔ اس سے کوئی مالی فائدہ تو نہیں پہنچا، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ انکی شہرت بڑھنے لگی۔

ان کے باپ نے بڑھئی کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا اور وہ سعادت مندی کے ساتھ اس پیشے میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے لیکن اس پیشے کو قریب قریب ترک کردیا اور بیشتر اوقات TYPE SETTING اور صحافت میں گزارتے رہے۔ اگرچہ ان کی کتاب کا غلط استعمال کیا گیا لیکن دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اپنی کتاب کا نام رکھنے میں انھوں نے ایمائیت کو پیش نظر رکھا ہے LEAVES OF GRASS (برگ گیاہ) ان کے نزدیک ایک علامت ہے جس سے موسم کی ہریالی، میدان، کھیت، جنگل مراد ہیں۔ LEAVES OF GRASS انگلستان کے ملک الشعرا ٹینسن LORD TENNYSON کو بہت پسند آئی۔ وہ اسے شاعرانہ تاثرات اور ایمائیت کی ایک عظیم مثال سمجھتے تھے۔ اس موضوع پر والٹ اور ٹینسن نے ایک دوسرے کو متعدد خطوط لکھے اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ والٹ کو ٹینسن کے مکتوبات اتنے عزیز تھے کہ وہ انھیں اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا کرتے تھے۔

لے WALL WHITMEN مصنفہ ایچ، ایس مورس

پر مشتمل ہے جن میں سے راقم نے صرف اکیس نظموں کا ترجمہ پیش کیا ہے)
پہلی بار ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت پر عظیم امریکی فلسفی ایمرسن
نے دادِ تحسین دیتے ہوئے لکھا "یہ مجموعہ فن وحکمت کا ایک عظیم شاہکار ہے
جو اب تک امریکہ پیش کر سکا ہے۔ ایک عظیم طاقت ہمیں مسرت بخشتی ہے
اور حق یہ ہے کہ میں اسے پڑھ کر بے حد مسرور ہوا۔ یہ کتاب ہمیں اپنے کردار
کو بلند کرنا اور دل میں عزم و حوصلہ رکھنا سکھاتی ہے۔

لیکن ایمرسن اور دیگر مشاہیر کے اعتراف کے باوجود دادِ سخن اور
مالی منفعت کے باب میں وہٹمین کو حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔
ان کے دوست اور سوانح نگار ڈاکٹر BLEEKE کا کہنا ہے کہ پریس
سے جب کتابیں چھپ کر آئیں تو انھیں نیویارک اور بروک لین کی دوکانوں میں
بکنے کے لئے بھیجا گیا۔ کچھ کتابیں مختلف رسالوں اور مصنفوں کے پاس ریویو
کے لئے بھیجی گئیں۔ لیکن انجام یہ ہوا کہ کتابیں دکانوں پر دھری کی دھری رہ گئیں
کوئی ان کا خریدار نہیں تھا۔ رسالوں نے اولاً اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اکثر
رائے دینے سے احتراز کرتے رہے اور اگر کسی نے کوئی رائے بھی لکھی تو نہایت
ہی تلخ انداز میں، بلکہ بعض اخبارات تو فحش کلامی اور مغلظات پر اتر آئے
نیویارک ٹائمز اور دی لندن کرٹیک (THE LONDON CRITIC)
جیسے اخبارات نے ان کی سخت مذمت کی۔ نیویارک ٹائمز نے انھیں
"نیم انسان" اور نیم درندہ بتایا اور ایک نقاد کی سنجیدگی کو بالائے طاق
رکھتے ہوئے وہٹمین پر برس پڑا "یہ کون بیہودہ نوجوان ہے جو شاعر وقت

وہٹ مین کا عنفوانِ شباب اسی سخت کوشی سے عبارت تھا۔ ۲۰، ۲۲ سال کی عمر میں جو نظمیں لکھیں ان میں ایک جاں گداز شدتِ فکر ہے جو کائنات کے ہر راز کو بے حجاب کر دینا چاہتی ہے وہ اس عمر میں زندگی اور موت کے مسائل پر سوچتے رہے لیکن عقدہ کشائی کے لئے جس عمر اور نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی پختگی کو نہیں پہنچی تھی۔ شاعر اپنے لہو کی آگ میں جلتا رہا اور اس عزم کے ساتھ کہ ایک دن وہ حقائق کے پردے اُٹھا دے گا۔

O MYSTERY OF DEATH I PANT FOR THE

TIME WHEN I SHALL SOLVE YOU

(پر اسرار موت، میں پیچ و تاب میں ہوں، مجھے اس دن کا انتظار ہے جبکہ میں تجھے بے نقاب کر سکوں گا۔)

۱۸۴۸ء تک یعنی دو سال تک بروک لین ایگل کے اڈیٹر رہے۔ مطالعۂ کتب ان کی روحانی غذا تھا۔ خواہ عام نقاد ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں وہ ہر مصنف، ادیب اور شاعر کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتے۔ ملٹن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "وہ روکھا پھیکا، بلند اور متکبر ہے"۔ گوئٹے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "بلا شک کردار ہی انسان ہے"۔ کولرج کے وہ بڑے معترف تھے، کہا کرتے تھے کہ "اس کے لہجے میں ایک بے ساختگی ہے، وہ بچوں کی سی بے سادگی کے ساتھ اپنا دل ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے"۔

ان کے کلام کا مجموعہ جو کم و بیش چھ سو نظموں (LEAVES OF GRASS

۱۸۴۱ء وہ یہیں ایک اسکول میں ٹیچر رہے اور ساتھ ساتھ ایک اخبار بھی نکالتے رہے جس کے وہ واحد پبلشر تھے۔ کوئی سال بھر تک وہ ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے رہے اس کے بعد نیویارک آئے اور یہاں روزنامہ AURORA کے مینجنگ اڈیٹر بن گئے۔ چند سال تک وہ مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے اور کسی نہ کسی طرح ڈیموکریٹ (DEMOCRATE) نیویارک (NEW YORK) ٹاٹلرسن (TATRALSICN) اور اسٹیٹسمین (STATESMAN) جیسے اخبارات سے منسلک رہے۔ عمر کے ۲۷ ویں سال میں قدم رکھنے کے بعد ذرا اطمینان کی صورت نظر آئی یعنی یہ کہ وہ بروک لین ایگل (BROOKLYN EAGLE) کے اڈیٹر بن گئے۔ اس کے علاوہ امریکن ریویو میں مضامین، اداریئے اور افسانے لکھتے رہے جس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنے اداریوں میں وہ نظامِ تعلیم اور قصاب کی اصلاح کی طرف اشارے کرتے رہے۔ درس گاہوں میں بچوں کو مارنے پیٹنے کا جو طریقہ رائج تھا ویٹ مین کو اس سے وحشت ہوتی تھی چنانچہ اس کے خلاف احتجاجی مضامین لکھے۔ پھانسی کی سزا کے خلاف بھی انھوں نے آواز بلند کی۔

ویٹ مین کا خاندان پیشہ وروں کا خاندان تھا۔ جسے پیٹ بھرنے کے لئے جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی۔ کسب معاش کے ساتھ ساتھ ویٹ مین نے مشق سخن بھی جاری رکھی۔ علامہ اقبال نے دورِ غلامی میں نوجوانوں کو پیام دیا تھا کہ

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

تعارف

والٹ ویٹ مین ۱۸۱۹ء میں ویسٹ ہلس، لانگ آئی لینڈ میں پیدا ہوئے ۱۸۲۳ء میں ان کا خاندان بروک لین میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۲۵ء میں وہ ایک اسکول میں داخل کر دئے گئے جہاں ۱۸۳۰ء تک زیر تعلیم رہے۔ اس لحاظ سے انھیں صرف ۱۱ سال کی عمر تک رسمی تعلیم نصیب ہو سکی۔ ان کے والدین نے معاشی بدحالی سے تنگ آکر انھیں کسی وکیل کے ہاں نوکر رکھوا دیا اور پھر وہ کسی ڈاکٹر کے ملازم ہو گئے۔ ان کے پہلے مالک نے ان کے ذوقِ مطالعہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ان کو ایک (CERCULATING LIBRARY) سرکولٹنگ لائبریری کا ممبر بنا دیا اور چندے اپنی جیب سے ادا کر دئے۔ لائبریری سے وہ الف لیلیٰ اور والٹر اسکاٹ WALTER SCOTT کے ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے ۱۲ سال سے ۱۶ سال کی عمر تک بروک لین (BROOK LYN) اور نیو یارک NEW YORK کے مختلف اخبارات میں کبھی آفس بوائے اور کبھی پرنٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

۱۸۳۵ء میں نیو یارک میں آتش زدگی کا حادثہ پیش آیا جس سے ویٹ مین بھی متاثر ہوئے اور لانگ آئی لینڈ LONG ISLAND واپس چلے آئے۔ ۱۸۳۶ء تا

"وٹمین کا نام بلندی کی انتہا کو چھو لیتا ہے۔ شعر میں تخلیق، جدت اور بے ساختگی کی ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک ایسی وسعتِ فکر کی بھی جو اس بات کی غمازی کرتی ہو کہ شاعر نے کائنات کو گہری نظر سے دیکھا ہے اور یہ کہ اسے انسانیت کا عرفان حاصل ہے۔"

"وٹمین ہمیں تصویریں دیتا ہے .... تصویریں"

رابندر ناتھ ٹیگور

فہرست مضامین

شکریہ

مترجم دوسروں کے جذبات وافکار اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے لیکن جب نجی احساسات کے اظہار کا موقع آتا ہے تو وہ کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ میں اپنے معزز رفیق کار اور بزرگ حضرت پرویز شاہدی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا اور بتانا چاہتا تھا کہ نظموں کے ترجمے میں کس طرح قدم قدم پر میری اصلاح اور رہبری کرتے رہے لیکن شکریہ کے لئے الفاظ میسر نہیں۔

حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ

کلکتہ میں اُردو کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا مسئلہ کچھ اتنا پریشان اور الجھا ہوا ہے کہ سوائے یاوسی کے کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اگر چند دوستوں اور مخلص طالب علموں کی رفاقت نصیب ہوتی تو شاید یہ مختصر سا مجموعہ بھی اشاعت کی منزل تک پہنچتا۔

اس سلسلے میں اپنے دوست اور رفیق کار پروفیسر قمرالدین صاحب (شعبۂ اسلامی تاریخ کلکتہ یونیورسٹی) کے جذبۂ خلوص اور ایثار کی دل سے قدر کرتا ہوں جنکے عملی تعاون نے میرے حوصلے بڑھا دئے۔

اس مجموعے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اسکی کتابت مولوی حافظ نظام الدین صاحب ایم۔اے (کلکتہ یونیورسٹی) نے کی جو ایک کامیاب استاد ہونیکے علاوہ ایک نکتہ رس ادیب و صحافی بھی ہیں۔

قارئین سے گذارش ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے مستفیض فرمائیں۔ ایک بار پھر میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۴۰ - تالتلہ لین - کلکتہ - ۱۶

عبدالرؤف

انتساب

منیرِ احمد مدہوش کے نام
جس کے ذوقِ سماعت نے
مجھے سہارا دیا

(۲)

بار اول

بار اول   تعداد اشاعت ۱۰۰۰

مطبوعہ

ستارۂ ہند پریس پرائیوٹ لمیٹڈ

نمبر ۲ بنیا پوکھر لین کلکتہ ۱۴

ناشر

پیپلز لائبریری

نمبر ۱۳۰/R اکرا روڈ، کلکتہ ۲۴

قیمت ایک روپیہ

والٹ وھٹمین

کی

۲۱ نظمیں

ترجمہ

عبد الرؤف

لکچرر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی

competent to give my opinion on the stylistic excellence of his translation. But a poem or two which I have read would appear to have been done in the right spirit— the language is very simple, and therefore his work does full justice to the style of Walt Whitman himself. I only hope that this book will have its appeal to all lovers of literature who read Urdu and will be fully appreciated by Urdu scholars and students.

Sunity Kumar Chatterji.

Emeritus Professor of Comparative Philology
University of Calcutta.

Chairman, West Bengal Lagislative Council
1952-65.

National Research Professor of India in
Humanities.

President, Sahitya Academy, New Delhi.

President, International Phonetic Association,
London.

avir avir ma edhi manavikisu bharatasya jatiya acaryah

SUNITI KUMAR CHATTERJI

National Professor of India in Humanities.

RESIDENCE
SUDHARMA
16, Hindusthan Park.
Calcutta-29.
PHONE : 46-1121.

OFFICE
National Library Campus
Belvedere.
Calcutta-27.
PHONE : 45-5319.

December 19.1959

Prof. Abdur-Rauf, Lecturer in Urdu in the University of Calcutta, has presented to the Urdu-reading public a selection of 21 short poems from Walt Whitman. I do not know whether any writer in Urdu ever attempted to present this great poet of universal humanism from America, who made his mark in world literature a couple of generations ago, in the garb of the Hindustani or Urdu language of India. Urdu is a great language, and it has, from its very inception one may say, an international atmosphere about it— it is the result of an attempt to harmonise the spirits of Indian, Central Asian, Iranian and Arab cultures. It is also a very effective vehicle for introduction of western ideas into India, as it does not have what has been called the spirit of "Dont't-touch-ism" about it, in its vocabulary for instance : it easily assimilates, as and when necessary, English words most naturally, as it has assimilated Persian and Arabic vocables, and is now also assimilating once again Sanskrit vocables as they are being made current by Hindi. Prof. Rauf read Hindustani Linguistics with me during his student days in the University, and he is an ardent and serious student of his mother-tongue. I am not